مجاز لکھنوی اور ان کی نظم 'رات اور ریل'

مجاز لکھنوی اردو شاعری کے ممتاز شعرا میں ایک اہم نام ہے۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے مجاز کا جنم ۱۹ نومبر ۱۹۱۱ میں اتر پردیش کے بارہ بنکی ضلع کے رودولی قصبہ میں ہوئی۔ ان کا نام اسرار الحق ہے اور مجاز ان کا تخلص ہے۔ مجاز نے زندگی کی محض ۴۵۔۴۶ بہاریں دیکھیں لیکن اس کم عمری کے باوجود مجاز نے اپنی شاعری کے ذریعہ وہ کارنامہ انجام دے دیا جس کی تمنا بہت سے شعرا کو ہوسکتی ہے۔ مجاز ایک انقلابی نوجوان تھا تو ایک گداز دل رکھنے والا عاشق بھی تھا لیکن اسے معشوق کا وصال نصیب نہ ہوا اور اس کے عشق کا سارا درد اس کی شاعری میں بھر گیا۔

مجاز نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں جاگیردارانہ نظام روبہ زوال تھا۔ حالانکہ ان کا تعلق جاگیردار خاندان سے تھا لیکن ان تک آتے آتے یہ محفل برخاست ہو رہی تھی۔ جاگیرداری تو نہ رہی تھی لیکن شان وشوکت کی کچھ علامتیں باقی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی زمینداری اور تعلق داریاں جاگیرداری نظام کی یادیں دلا رہی تھیں۔ اسی ماحول کے پروردہ مجاز لکھنوی نے اگرچہ عیش وعشرت کا زمانہ نہ تھا تاہم ان کی پرورش نازونعم میں ہوئی۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے ان کے لئے ایک نوکر بھی مقرر تھا۔ مجاز کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی بعد ازاں ان کے والد سراج الحق جو محکمہ رجسٹریشن میں ہیڈ کلرک تھے، تبادلہ ہو کر لکھنو آئے تو مجاز بھی لکھنو آگئے۔ انہوں نے امین آباد ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مجاز آگرہ آگئے جہاں انہیں فانی بدایونی جیسے شاعر کی صحبت نصیب ہوئی۔ زندگی کے کرب سے دوچار فانی نے جس نوعیت کی شاعری کی ہے اس میں یاس وحسرت اور زندگی کی فنائیت کے سوا شادمانی اور شادکامی کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ دوسری طرف میکش اکبرآبادی کی صحبت بھی ملی۔ میکش جہاں رہتے تھے اس کے اطراف میں طوائفیں بھی آباد تھیں۔ اس کا اثر یقیناً مجاز کے ذہن پر بھی پڑا ہوگا۔ حالانکہ آگرہ کے قیام کے درمیان کالج کے مشاعرہ میں مجاز نے گولڈ میڈل بھی جیتا اور ان کی شاعری پروان چڑھتی رہی لیکن مجاز کے اندر کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ آگرہ کے قیام کے دو تین سال کا وقفہ مجاز کی زندگی کے لئے اتھل پتھل بھرا رہا۔ لیکن جب مجاز وہاں سے رخت سفر باندھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچے تو ایک نئی محفل میسر آگئی۔ ایک طرف آزاد خیالی کو جلا ملی تو دوسری طرف ادیبوں اور شاعروں کی صحبت کے علاوہ انقلابی رجحان کو بھی فروغ ملا اور مجاز ایک انقلابی شاعر بن گئے۔ علی گڑھ میں جہاں ایک طرف لڑکیاں مجاز اور ان کی شاعری پر شیدا تھیں وہیں ادبی ماحول انہیں ایک بڑا شاعر بننے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اس وقت لکھنو میں بڑے بڑے شعرا و ادبا موجود تھے جن میں جذبی، جاں نثار اختر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، سردار جعفری، حسرت موہانی اور دیگر شامل تھے۔ مجاز کے اس عہد کے بارے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ان کا زیادہ تر وقت دوستوں کے کمروں میں گزرتا تھا۔ ان میں جاں نثار اختر، اختر امام اور حامد متین کہ اچھے کھلاڑی تھے یاد آتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۳۲ میں انجمن حدیقۃ الشعرا کا سالانہ مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر نے کی تھی اور جس میں مولانا حسرت موہانی، اصغر گونڈوی اور حفیظ جالندھری بھی شریک ہوئے تھے۔ طلبا کے لئے اس میں نظم کا ایک عنوان 'صبح بہار' رکھا گیا تھا۔ مجاز کی نظم پر شروع میں حسب معمول ہوٹنگ ہوئی مگر بعد میں

اس کی رنگینی اور دلکشی اور پڑھنے والے کے پر سوز ترنم نے داد بھی حاصل کی۔ یہ مجاز کا علی گڑھ سے پہلا تعارف تھا۔‘‘

یہی رنگینی اور دلکشی مجازی کی شاعری کی جان ہے جس نے مجاز کو نا قابل فراموش شاعر بنا دیا۔ اسی علی گڑھ یونیورسٹی میں مجاز نے اپنی معروف نظم ’نذر علی گڑھ‘ کہی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترانہ بنی اور آج بھی گائی جاتی ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

سرشار نگاہ نرگس ہوں پا بستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

مجاز لکھنوی نے ۱۹۳۵ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ اور ریڈیو کی ملازمت اختیار کر لی لیکن یہ ملازمت مخالفین کی ریشہ دوانیوں کے سبب تا دیر قائم نہ رہ سکی۔ قیام دہلی کے دوران مجاز کو ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ لیکن یہ ایسا عشق تھا جس کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ ایک بڑے خاندان کی اکلوتی بیٹی جو شادی شدہ تھی مجاز کے لئے سوہان روح بن گئی۔ وہ مجاز جس پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لڑکیاں جان چھڑکتی تھیں ایک وقت ایسا آیا کہ کوئی لڑکی اس سے شادی کے لئے آمادہ نہ ہوتی تھی۔ جن دنوں گھر میں شادی کی بات ہوتی تھی مجاز کی پسند پر کوئی لڑکی نہیں اترتی تھی۔ مجاز اختلال کا شکار ہو گیا، جنوں کے دورے پڑے اور دلی کی سڑکوں پر دیوانہ وار پھرا۔ جوش ملیح آبادی جن کے ماہنامہ ’آجکل‘ کے ایڈیٹر تھے ایک نظم اصلاح برائے مجاز لکھ کر آجکل میں شائع کرا دی۔ یہ بات بھی مجاز کے لئے تکلیف دہ ہوئی۔ مجاز کو ئی رانچی کے پاگل خانے میں بھی داخل کرایا گیا۔ بعد ازاں لکھنو اپنے گھر آ گئے۔ اہل خانہ پریشان تھے۔ والدہ چاہتی تھیں کہ شادی ہو جائے تو شاید دماغی حالت بہتر ہو لیکن مجاز بلانوش بھی تھا۔ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ صرف شعر کہنا جانتا تھا۔ اسی درمیان لکھنو میں طلبا کا ایک کنونشن ہوا جس میں ساحر لدھیانوی، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری اور کئی دوسرے اس عہد کے نامور ادیب و شاعر شریک تھے۔ مجاز کچھ دوستوں کے ساتھ لال باغ میں واقع ایک دیسی شراب کے اڈے پر پہنچ گئے۔ دیر رات تک مے پی گئی۔ بعد ازاں دوست احباب چلے گئے۔ مجاز شاید اس قابل نہ رہا کہ خود سے گھر چلا جاتا۔ انتہائی سرد رات میں وہ شراب خانے کی چھت پر پڑا رہا۔ اس پر بے ہوشی کی کیفیت طاری رہی۔ آخر کار اس کے دماغ کی نسیں پھٹ گئیں اور ۵/دسمبر ۱۹۵۵ کو محض تقریباً ۴۴ سال کی عمر میں مجاز اس دنیا سے چل بسا۔

لیکن مجاز نے اس مختصر زندگی میں اردو شاعری کو بہت کچھ دیا۔ اس کی شاعری دو سطحوں پر گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک انقلاب اور دوسرا رومان۔ ایک انقلابی شاعر کے طور پر اسرار الحق مجاز کو شاید وہ اہمیت نہیں جو علی سردار جعفری کی ہو سکتی ہے لیکن اس کی شاعری کی رنگینی اور دلکشی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کی رومانوی شاعری زیادہ اپیل کرتی ہے۔ اس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے معروف ترقی پسند ناقد خلیل الرحمان اعظمی نے لکھا ہے کہ:

’’مجاز ان ترقی پسند شعرا میں ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے دور عروج میں سب سے زیادہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کی۔ نوجوان شعرا میں سب سے پہلے ان کا مجموعہ کلام ’آہنگ‘ سامنے آیا جس پر سجاد ظہیر نے تعارف لکھا تھا۔ مجاز کی نظموں کو نہ صرف نوجوانوں نے بلکہ صنف نازک نے اپنے سینے سے لگایا۔ عصمت کے قول کے مطابق ’آہنگ‘ شائع ہوئی تو علی گڑھ کے گرلس کالج کی لڑکیاں اسے اپنے سرہانے تکیوں میں چھپا کر رکھتی تھیں اور آپس میں بیٹھ کر پرچیاں نکالتی تھیں کہ ہم میں سے کس کو مجاز دلہن بنائے گا۔ بقول عزیز احمد مجاز کی شاعری انقلاب اور تغزل کا حسین ترین امتزاج ہے۔۔۔۔‘‘

اور انقلاب اور تغزل کا یہی حسین ترین امتزاج مجاز کی نظم ’رات اور ریل‘ میں بھی نظر آتا ہے۔ مجاز لکھنوی نے بہت سی کامیاب

نظمیں اردو ادب کو دی ہیں۔ مثلاً آوارہ، تعارف، نذر دل، اندھیری رات کا مسافر، خواب سحر، عشرت تنہائی، مجبوریاں، کس سے محبت ہے اور اعتراف وغیرہ۔ ان ہی کامیاب نظموں کی فہرست میں 'رات اور ریل' کو شامل کیا جاتا ہے۔ اس نظم میں مجاز کا رومانوی انداز بیان اپنے شباب پر ہے۔ اس کی رنگینی اور دلکشی، تشبیہات و استعارات کا استعمال اور اس کے ساتھ انقلاب کی باتیں اس نظم کو یادگار بناتی ہیں۔ ریل ایک مسلسل چلنے والی، نہ تھکنے والی اور اپنے چنگھاڑ سے زمین کے سینے میں دھڑکن پیدا کرنے والی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ جس کی بنیاد پر شاعر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اسی کے مانند ایک انقلابی کو ہونا چاہئے جو کوہ و بیاں سے دندناتی ہوئی گزر جائے۔ رات کا سینہ چاک کر دے۔ اس نظم کے کے ابتدائی اشعار دیکھیں:

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی جھومتی سیٹی بجاتی کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرود دل نشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی

گویا یہ ریل بچوں کو لوریاں سنا کر خواب راحت کا پیغام دیتی ہے تو نازنینوں کو سنہرے خواب بھی دکھلاتی ہے۔ اس نظم میں ریل کے پورے پس منظر کے ساتھ شاعر آخر میں اس مقام پر پہنچتا ہے جو اس کا اصل مقصد ہے اور جو بطور پیام وہ قاری کو دینا چاہتا ہے۔ نظم کے آخری اشعار اس طرح ہیں:

ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سیکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعر آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

چونکہ مجاز کا دور انقلابی تھا۔ ملک میں ایک طرف آزادی کی تحریک جاری تھی تو دوسری طرف ترقی پسند مصنّفین کی تحریک بھی زوروں پر تھی۔ ترقی پسند ادبا و شعرا تحریک آزادی میں شامل تھے اور انگریزوں کے ظلم و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے

تھے۔مجاز نے آخری اشعار میں اپنا مدعا آشکار کر کے اس نظم کا رخ انقلاب کی طرف موڑ دیا ہے۔ورنہ پوری نظم ایک رومانی کیفیت کے ساتھ بچوں کے لئے لکھی گئی ایک نظم معلوم ہوتی ہے حالانکہ جو اس کا تیور اور انداز ہے وہ کسی بھی قاری کے لئے دلچسپی کا سبب رکھتا ہے۔ بہرکیف نظم ’رات اور ریل‘ مجاز لکھنوی کی کامیاب ترین اور اہم نظموں میں سے ایک ہے۔یہ نظم اس طرح ہے۔

نظم ’رات اور ریل‘

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی جھومتی سیٹی بجاتی کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرود دل نشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر لچکتی گنگناتی جھومتی
سرخوشی میں گھنگرووں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی کانپتی
پٹریوں پر دور تک سیماب جھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی
منتشر کر کے فضا میں جا بجا چنگاریاں
دامن موج ہوا میں پھول برساتی ہوئی
تیز تر ہوتی ہوئی منزل بمنزل دم بہ دم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے

رفعت کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
رعشہ بر اندام کرتی انجم شب تاب کو
آشیاں میں طائر وحشی کو چونکاتی ہوئی
یاد آ جائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی
ایک رخش بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
مرغ زاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی
اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغ طور دکھلاتی ہوئی
جستجو میں منزل مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں ساز سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی مڑتی مچلتی تلملاتی ہانپتی
اپنے دل کی آتش پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی
خودبخود روٹھی ہوئی بپھری ہوئی بکھری ہوئی
شور پیہم سے دل گیتی کو دھڑکاتی ہوئی
پل پہ دریا کے دما دم کوندتی للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکا یک دوڑ کر
دندناتی چیختی چنگھاڑتی گاتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی

ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی
تیزئی رفتار کے سکے جماتی جا بجا
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی
ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی
صفحۂ دل سے مٹاتی عہد ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دل کش خواب دکھلاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
دامن تاریکیٔ شب کی اڑاتی دھجیاں
قصر ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آ جائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
زعم میں پیشانی صحرا پہ ٹھوکر مارتی
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ ڈراتی ہوئی
ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سیکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعر آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

ڈاکٹر توقیر عالم توقیر، شعبۂ اردو، مولانا مظہر الحق یونیورسٹی، پٹنہ